

مولانا شبلی نعمانی

سال ولادت: ۱۸۵۷ء

سال وفات: ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع بندول میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد شبلی تھا مگر امام ابو حنیفہؒ کی نسبت سے شبلی نعمانی کہلانے لگے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ غازی آباد میں مولانا فاروق سے عربی و فارسی ادبیات اور منطق و فلسفہ پڑھا۔ اس کے بعد شبلی رام پور چلے گئے جہاں مولانا ارشاد حسین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے لاہور اور سہارن پور میں ”حماسہ“ اور علم حدیث پڑھا۔ انیس برس کی عمر میں شبلی نے حرمین شریفین کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ بھی گئے اور مختلف کتب خانوں کی سیر کے بعد وطن واپس آ کر شعر و ادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

شبلی نے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان بھی پاس کیا مگر ان کا اس پیشے میں جی نہ لگا اور انھوں نے وکالت ترک کر دی۔ ۱۸۸۱ء میں شبلی کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ اس ملاقات میں سرسید، شبلی کا لکھا ہوا مدحیہ قصیدہ پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں سرسید نے انھیں عربی اور فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔ ۱۸۸۷ء میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ہی شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور انھیں عربی سکھائی۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے آرنلڈ کی ہمراہی میں قسطنطنیہ کا دورہ کیا اور دو ماہ تک بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مشغول رہنے کے بعد واپسی پر ”سفر نامہ روم و مصر و شام“ لکھا۔ ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ میں قیام کے دوران میں شبلی ”ندوة العلماء“ سے وابستہ ہو گئے مگر اس وابستگی کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ سکے اب وہ ادارہ ”دارالمصنفین“ کے قیام میں لگ گئے اور اپنا سب کچھ علم و ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دینے کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو راجی ملک عدم ہو گئے۔

شبلی ایک عظیم مفکر، نامور مؤرخ، نقاد، سوانح نگار، تبصرہ نگار، واعظ اور شاعر بھی تھے۔ ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات روانی، خشکی، ادبی چاشنی، فکر کی گہرائی اور دلیل کے ساتھ بات کرنے کا مؤثر انداز ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا مگر اس کے باوجود نثر کی سادگی، خشکی اور ادبی حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

مولانا شبلی کی اہم تصانیف یہ ہیں:

الماسون، الغزالی، سوانح مولانا روم، الفاروق، سیرۃ النعمان، علم الکلام، الکلام، شعر العجم، موازینہ انیس و دہر، سفر نامہ روم و مصر و شام، مضامین عالمگیر اور سیرۃ النبیؐ۔

مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم

۱۳۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف شروع نہیں ہوئی تھی، جو تعلیم و تعلم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرز زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدت میں..... تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی۔ اس دور میں جن علوم کو رواج عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپوں سے بھرا ہے۔ دیکھو دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتہ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم و فنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرد ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں کتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیل مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں۔ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے ذاتی مکانات ہیں لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے بڑے بڑے عالی شان قصور و ایوان میں بھی، جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس وقت اس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصد کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات تخت گاہوں کی بربادی، چین کی تباہی، تاتاری کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزاروں میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر وہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر سپرنگر صاحب تحفینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حامل مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ کردہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقہ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغول درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دوسوا ماہ حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی الملا جس کو اردو میں لیکچرر دینا کہتے ہیں۔ استاد ایک بلند

مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب العلم جو ہمیشہ قلم و دوات لے کر بیٹھتے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہل کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہل فن کی لائف چھان ڈالو۔ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہو اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ میں گوہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھی علماء کے حالات میں ہے جو چین سے مصر و شام و بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر چین میں داخل ہوئے۔ جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے۔ بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں تھیں۔ ان میں علماء اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علماء کا مخصوص لباس تھا۔

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔

(۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی۔ قرآن و حدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ اتنے تعلق سے نحو، صرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزاء تھے۔ فلسفے نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے جس کی ہمتیں بلند ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی تو اُسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں، مذہب نے ان کو بھی انہی سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔ وزراء، حکام، فوجی اہل منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بولے سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا، حاصل کر سکتا تھا۔ اہل کمال کے زمرے میں سیکڑوں گزرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امراء اور اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا، عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔

سلاطین و وزراء تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے نہیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں خریداجاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زور طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ نصاب تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔ پرائیویٹ تعلیم گا ہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی، گولکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (عراق و غیرہ) میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت اہتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق و امثال ذالک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھی کی نذر ہو گیا اور اتنا وقت نذر سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔ تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔

انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کیے، ان مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔ ایک خاندان کلیتاً برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے، دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نہ کر سکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیے جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈنا چاہیے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۱۷۸۷ء میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقہ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصد اہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آپ و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

(مقالات شبلی)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- ”املا“ کس طریقہ تعلیم کو کہا جاتا تھا؟

ii- کون سی کتاب ”امالی“ کے نام سے مشہور ہوتی تھی؟

iii- ”طیلان“ کے کہا جاتا تھا؟

iv- اعلیٰ تعلیم کے لئے کون سی دو چیزیں لازمی خیال کی جاتی تھیں؟

2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا۔

ii- فلسفے نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

iii- وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بوطی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

iv- انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوئے تعلیمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔

v- مضمون میں مذکور تین علمی شخصیات کے نام لکھیں۔

3- سبق میں چند قدیم علوم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے درج ذیل علوم کے بارے میں مختصر بتائیں:

i- اسماء الرجال ii- تذکرہ iii- طبقات iv- منطق

4- قدیم طرز تعلیم کے حوالے سے ”مناظروں“ کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیں۔

5- سبق میں چند ایسے شہروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلامی دنیا میں علم و ادب کے مراکز کے طور پر مشہور تھے ان کے نام لکھیں۔

6- شبلی کے اسلوب تحریر پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

7- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:

i- تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔

ii- صرف ہم عصر وہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

iii- اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہل کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

iv- امرا اور اہل منصب کا گروہ جو شاہنشین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔

8- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معنی لکھیں:

تعلیم و تعلم، اسماء الرجال، مستند، ہنوز، نکتہ چیں۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

طنز و مزاح

طنز اور مزاح دو الگ الگ لفظ ہیں۔ طنز معاشرے کی ناہمواریوں اور اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف مدائے احتجاج ہے۔ طنز چونکہ تلخ ہوتا ہے اس لیے اس میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے طنز نگار مزاح کا سہارا لیتا ہے تاکہ فرد یا معاشرے پر ہونے والی زیادتیوں کی نشان دہی بھی ہو جائے اور طنز پڑھنے والوں کے لیے طنز قابل مطالعہ بھی بن جائے۔

مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار کیا جائے۔ مزاح نگاری کے لیے موازنہ زبان و بیان کی بازی گری، مزاحیہ صورت واقعہ، کسی مزاحیہ کردار کی تخلیق اور پیروڈی یعنی تحریف جیسے پانچ حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ طنز اور مزاح میں فرق یہ ہے کہ طنز نفرت اور برہمی سے جنم لیتا ہے جبکہ مزاح محبت اور ہمدردی سے۔ طنز میں زہر تاکی، نشتریت، کاٹ، طعن، عناد، تضحیک اور بعض اوقات جھٹکا ہٹ اور چڑا پن نمودار ہو جاتا ہے جبکہ مزاح ان سے بری ہوتا ہے اور صرف اپنی لطافت کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ خالص مزاح کو طنز کی ضرورت نہیں لیکن طنز ہر حال میں مزاح کا محتاج ہے۔ طنز لازمی طور پر کسی اصلاحی مقصد کا پابند ہوتا ہے جبکہ مزاح کا مقصد محض مسرت آفرینی بھی ہو سکتا ہے۔ طنز یہ اور مزاحیہ بیان نسبتاً زیادہ اثر اور دل نشیں ہوتا ہے۔

طنز و مزاح ادب کی صنف نہیں بلکہ دو صفات ہیں۔ اس لیے یہ نظم و نثر کی ہر صنف میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں۔ اردو نثر میں طنز و مزاح کی سب سے پہلی صورت غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ اس کے بعد ”اودھ پنچ“ کے نثر نگار آتے ہیں جن میں منشی سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھویک ستم ظریف، پنڈت تر بھون ناتھ، سید محمد آزاد، منشی جواہر پرشاد، برق زیادہ، اہمیت کے حامل ہیں۔ مزاح نگاری کے اگلے دور میں تین نام سر فہرست ہیں یعنی فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی، ان کے بعد عظیم بیگ، چغتائی، ملا رموزی اور شوکت تھانوی وغیرہ کا نام آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، امتیاز علی تاج اور کنہیا لال کپور نے بھی مزاح میں نام پیدا کیا۔ جدید دور میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، کرل محمد خاں، شفیق الرحمن، ضمیر جعفری اور عطاء الحق قاسمی اہم مزاح نگار ہیں۔